ڈاکٹر علی بیات
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف تہران، ایران۔

ادیب الممالک فراہانی اور مولانا حالی: ایک تقابل

Dr Ali Bayat

Assistant Professor, Urdu Department, University of Tehran, Iran.

Adib ul Mamalik Farahani and Maulana Hali: A Comparative Study

The mid period of the 19th century is of paramount importance i.e, literary, social, economic, political and in all other aspects in Iran and India. The end of the Muslim regime, the British rule and due to the unwise policies of the Qajari family in Iran, their being trapped in the political trap of the British and the Russian rulers had made the lives of both the states very miserable. To some extent the nations were becoming the cause of trials and tribulations. In these circumstances some literary personas also became a voice of the masses along with the social and political leadership and helped them in their on march towards consciousness and liberty. Among these literary figures two most vibrant were the contemporary figures, one Adib ul mamalik in Iran and the other was Altaf Hussain Hali in Hindustan seem to be the thriving in the literary fields in their respective societies. In this article, the literary master of the two countries, Adib ul mamalik`s Musamat and Hali`s Musasdas in the perspective of comparative study is particularly presented.

محمد صادق الحسینی معروف بہ میرزا صادق خان ملقب بہ ادیب الممالک فراہانی اور متخلص بہ امیری، ۱۴ محرم ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء کو(۱)، ایک معزز گھرانے میں اَراک کے ایک گاؤں گازران میں پیدا ہوئے (۲)۔ والد کا نام حاج میرزا حسین تھا۔ حاج میرزا حسین کے دادا، میرزا معصوم شاعر تھے اور محیط تخلص کرتے تھے۔ میرزا معصوم، میرزا ابوالقاسم قائم مقام، محمد شاہ قاجار کے وزیر کے بھائی تھے۔(۳) یہ وزیر قاجاری عہد کے مشہور ادیب اور دانشور تھے۔ محمد صادق کے والد جب وہ پندرہ سال کے تھے، فوت ہوئے۔ اراک اور اس نواح کے حاکم، ناصرالدولہ نے ان حالات سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور محمد صادق اور ان کی خاندانی جائیداد پر تعرض کیا۔ ان حالات میں وہ چار و ناچار اپنے ایک بھائی سید مہدی کے ساتھ، اپنا گاؤں چھوڑ کر تہران روانہ ہوئے۔(۴) تہران جا کر انہوں نے اپنے دور کے مطابق روایتی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور فارسی و عربی اور بہت سے دوسرے علوم میں کافی مشق بہم پہنچائی۔ آگے جا کر فرانسیسی زبان میں بھی کچھ مہارت حاصل کر لی۔ بچپن سے شاعری کا شوق تھا اور پروانہ تخلص کرتے تھے۔(۵) ضروری تعلیمات کے حصول اور مختلف اساتذہ سے بہرہ یاب ہونے کے بعد، تہران میں اپنی

ذہانت اور شاعری میں تبحر کی بدولت، اونچے درجے کے شعرا کی محافل میں ان کو پذیرائی ملی اور بہت جلد اپنے دور کے صف اول کے شعرا میں شمار ہونے لگے۔ اس دور کے وزیر فوائد عامہ امیر نظام گروسی سے ملاقات کے بعد، اس کے عقیدتمندوں میں شامل ہوگئے۔ اس لیے انھوں نے اپنا تخلص ''پروانہ'' سے ''امیری'' میں تبدیل کر دیا۔ کہا جاتا ہے ناصر الدین شاہ قاجار کے حکم کے مطابق انہوں نے یہ تخلص اختیار کیا۔ (ہمان، ۸-۹۷) اسی وزیر کے ساتھ شاہزادہ طہماسب میرزا مؤید الدولہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کی فرمائش پر فی البدیہہ ایک قصیدہ پیش کیا جو بہت مقبول ہوا۔ یہ قول بھی بڑا مشہور ہے کہ اس کے بعد امیر نظام نے انہیں ''امیر الشعرا'' کا لقب دیا۔ (۷) امیر نظام ایک شہر کرمانشاہ کی حکومت پر منصوب ہوا تو میرزا صادق بھی اس کی معیت میں چار سال کرمانشاہ میں رہے۔ ۱۲۷۳ق میں تہران واپس آئے اور مظفر الدین شاہ قاجار کی خدمت میں ایک مدحیہ قصیدہ پیش کیا۔ اس پر بادشاہ نے انہیں ''ادیب الممالک'' کے لقب سے نوازا۔ (۸) امیر نظام کے ساتھ تبریز گئے اور وہاں ایک مذہبی تعلیمی مرکز ''مدرسہ لقمانیہ'' کے صدر کے قائم مقام کا عہدہ سنبھالا۔

ادیب الممالک، شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ صحافتی امور میں بھی بڑی رغبت سے حصہ لیتے۔ انھوں نے ۱۳۱۶ھ میں تبریز سے ایک اخبار ''ادب'' شائع کیا جو ۱۳۲۰ھ تک جاری رہا۔ ۱۳۲۱ھ میں ''ایران سلطانی'' کے نام سے ایک اخبار کے ایڈیٹر کی خدمات سرانجام دیں اور دو سال بعد، شہر بادکوبہ سے شائع ہونے والے ایک ترکی اخبار کے فارسی حصے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ تبریز سے واپس آئے تو ''مجلس شوریٰ ملی'' (قومی اسمبلی) کے افتتاح کے بعد، ایک اخبار ''مجلس'' کے ایڈیٹر کا عہدہ سنبھالا اور آٹھ ماہ بعد، ۱۳۲۵ھ میں ایک اخبار ''عراق عجم'' کے نام اپنا اخبار جاری کیا۔ ادیب الممالک ۱۲۸۹ھ میں ''انقلاب مشروطیت'' کی صف میں شامل ہو کر اس کے فعال رکن بن گئے۔ وہ اپنے اخبارات اور شعر و شاعری کے ذریعے اس دور کے انقلابی افکار کی ترویج میں مصروف ہوگئے۔ اس زمانے کی عدالت میں ایک عہدہ قبول کرنے کے بعد، ایک عرصہ کے لیے اس ادارے کی نوکری سرانجام دی۔ لیکن وہاں بھی عدالت کے حکام کا دوغلا پن اور عوام کے ساتھ ان کے ظلم و ستم کو دیکھ کر ان حالات پر کڑی تنقید کرنے لگے۔ انہوں نے اپنی کئی نظموں میں اس بات کا تذکرہ کیا ہے۔ ۱۳۳۵ھ میں عدالت کے کلرک کے طور پر یزد گئے اور وہاں مصروف ہوگئے۔ لیکن علالت کی وجہ سے یزد میں ان کا قیام مختصر رہا۔ چونکہ ان پر سکتہ کا عارضہ طاری ہوا اور وہ اس حالت میں تہران واپس آئے اور اسی بیماری پر بالآخر ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ میں وفات پا گئے۔ (۹) بعض محققین نے ان کی وفات کا سال ۱۳۳۶ھ لکھا ہے۔ (۱۰) یہ اختلاف سن ہجری قمری میں ہے اور عیسوی سال کی رو سے صحیح سن وفات ۱۹۱۸ء ہے۔ (۱۱)

مضمون کے اس حصے میں مولانا الطاف حسین حالی کی سوانح کا ذکر بھی ضرورت تھی، لیکن چونکہ اس مضمون کے قاری مولانا اور ان کی سوانح سے بخوبی آگاہ ہیں، اس سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔ البتہ اس بات کی طرف توجہ دلانا ضروری نظر آتا ہے کہ مولانا کی پیدائش ۱۲۳۵ھ/ ۱۸۳۷ء میں ہوئی اور ۳۱ دسمبر ۱۹۴۱ء میں وہ وفات پا گئے۔ (۱۲) اب اگر ان دونوں شعراء کی تاریخ پیدائش اور وفات کو دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ عمر میں مولانا حالی، ادیب الممالک سے بڑے ہیں، لیکن وہ ایک عصر کے شاعر اور ادیب شمار ہوتے ہیں۔ چونکہ مولانا کی وفات کے دو سال بعد، ادیب الممالک بھی فوت ہوگئے۔

۱۴ویں صدی ہجری میں ایران اور ہندوستان کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی ماحول تو یقیناً الگ تھے، لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملت اسلامیہ کے حالات مجموعی طور پر ناگفتہ بہ تھے۔ ان مایوس کن حالات کی عکاسی بیشتر ادیبوں اور دانشوروں کے کلام اور تصنیفات میں ملتی ہے۔ قاجاری عہد، ایران کی تاریخ میں ایک ایسا عہد ہے جس میں ایران کی قومی اور جغرافیائی وحدت کو شدید ضرب لگی۔ اس دور میں ہر روز عوام پسماندہ ہو رہی تھی اور حکام و بادشاہوں کی بے تدبیری کی وجہ سے غربت اور افلاس تمام ملک

میں راج کر رہی تھی۔ ایسے حالات میں اجنبی حکومتیں یعنی شمال کی طرف سے روس کے حکام اور جنوب کی طرف سے انگریزوں نے حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ملک کے بعض صوبوں کو کو مرکزی حکومت کی نگرانی سے الگ کر کے اپنی کٹھ پتلیوں کو سونپا۔ بادشاہ اور امراء و اشراف بھی ملک کی نظم و نسق سے ہمیشہ کی طرح غفلت برتتے رہے۔ حتی کہ ناصرالدین شاہ قاجار نے مزید عیاشی کے لیے روسی اور انگریزی حکومتوں سے بھاری رقم کا قرضہ لیا اور اس طرح ان کو ایران کی تقدیر پر ایسا سوار ہونے دیا کہ اس بدبختی اور ادبار سے رہائی کے لیے ایرانی عوام نے ایک صدی کی قریب جانفشانی کرنے اور ہزاروں قربانیاں دینے کے بعد آزادی حاصل کر سکے۔ اس دور میں بدامنی اور قتل و غارت گری تمام ملک میں عام ہوگئی۔ عوام کے حقوق ہر صورت میں نظر انداز کیا جاتا تھا اور ان کو باہر کی دنیا سے ہر طرح کی آگاہی سے محروم رکھا جاتا تھا۔ ملک میں اس شدت کی ویرانی اور عوام کی ذلت آمیز زندگی قوم کے ہمدرد اور آگاہ طبقے سے کی برداشت نہ ہوسکی۔ ملک کے مختلف شہروں اور خاص طور پر تہران میں بیرونی قوتوں اور بزدل حکمرانوں کی کمزوری کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں اور آخر ایک بھرپور انقلاب کی شکل اختیار کی۔ اس کے بعد انقلابیوں کے اصرار سے بالآخر ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء میں مظفرالدین شاہ نے مجبور ہوکر، ''مشروطیت'' کے طرز حکومت کی سند پر دستخط کیے۔ (۱۳) یہ ایک اہم تبدیلی تھی، جس کے بعد ایران رفتہ رفتہ جدیدیّت کے دور میں داخل ہوا۔ اس وقت ادیب الممالک کی عمر ۴۷ سال کی تھی۔ وہ شروع میں مشروطیت کے حامیوں میں شامل ہوگئے۔ مشروطیت کا دور بہت مختصر رہا اور محمد علی شاہ نے اسمبلی پر توپ برسانے کا حکم دے کر، بہت سے مشروطیت پسند لیڈروں کو موت کی گھاٹ اتار دیا۔ اس حادثے پر ادیب الممالک نے ایک نظم میں تہران کے بہارستان پر جہاں قومی اسمبلی کا ہال بنایا ہوا ہے، یوں ماتم کیا ہے:

اے کاخ بہارستان سقفت ز چہ وارون شد؟ — اے رشک نگارستان خاکت ز چہ گلگون شد؟
تو بارگہ دادی، کے در خور بیدادی؟ — چون کار تو آزادی، افکار تو قانون شد!
آوخ کہ ز استبداد، قانون تو شد برباد — تقدیر چنین افتاد، اوضاع دگرگون شد
از عشق تو سرمستم، وز غیر تو رَستم من — مشروطہ پرستم من، قلبم بہ تو مفتون شد (۱۴)

تہران اور ملک کے مختلف شہروں میں موجود حالات کے خلاف احتجاجات کی صداؤں سے بالآخر محمد علی شاہ کو برخاست کر دیا گیا اور اس کا نوجوان بیٹا احمد شاہ، بادشاہ مقرر ہوا۔ لیکن ان حالات کی وجہ سے ملکی استقلال اور اقتدار کو پھر سے ایک ضرب کاری لگی۔ ادیب الممالک نے ان تمام حالات کا مشاہدہ کیا۔ بلکہ جیسا کہ اس سے پہلے کہا گیا وہ اس دور میں سیاست کے ایک فعال رکن کے طور پر ناگوار حالات کے خلاف اپنے اخبارات اور کلام کے ذریعے احتجاج کرنے لگے۔

ادیب الممالک نے اپنی زندگی کے دوران قاجاری خاندان کے چار بادشاہوں کو دیکھا۔ اس طرح یوں کہا جاسکتا ہے کہ ادیب الممالک اُن معدودے چند شعراء میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے ایران کی تاریخ کے کئی اہم سیاسی ادوار کا بخوبی ادراک کیا: ۱- ماقبل مشروطیت کا دور، ۲- مشروطیت کا دور، ۳- محمد علی شاہ کے استبداد کا دور، ۴- انقلابی مجاہدوں کے ہاتھوں تہران کی فتح کا دور اور ۵- مشروطیت کے انقلاب سے مایوسی کا دور۔ (۱۵) ادبی پہلو سے یہ عہد، فارسی شاعری کا عبوری دور ہے۔ ان وجوہات کی بناپر، ادیب الممالک کے کلام میں مختلف قسم کے مضامین ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اسلاف کی طرح، شعر گوئی کا آغاز مدح سے کیا اور صلے کی لالچ اور تلاش معاش کے سلسلے میں اپنے عہد کے بادشاہ، امراء اور نوابوں کی خوشامد میں کئی قصیدے لکھے۔ (۱۶) مثال کے طور پر وہ قاجاری خاندان کے کمزور و بیمار بادشاہ، مظفرالدین شاہ کے قصیدے کے ضمن میں لکھتے ہیں:

ز ہیبتت جگر سنگ خارہ نرم شود — چنانکہ آہن شد نرم در کف داؤد

تو می توانی غلطاند ماہ را ز فلک　　چنانکہ فرہاد از کوہ بیستون جلمود (۱۷)

اصل میں ادیب الممالک فارسی ادب کے ایک ایسے دور کے شاعر تھے جس سے ''بازگشت ادبی'' کے دور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس طرز کے شعراء نے ''سبک ہندی'' کے کلام سے اپنی بیزاری کا اعلان کر کے یہ فیصلہ کیا کہ قدماء کی تتبع میں شاعری کریں گے۔حقیقت یہ ہے کہ اس کوشش میں وہ نہ صرف کامیاب نہ ہوسکے، بلکہ انھوں نے اس بے سوچے سمجھے اقدام کے ذریعے، فارسی شاعری کو کسی دوسری مشکل میں دھکیل دیا۔اس نامناسب فیصلے کے بعد جو فارسی شاعری کے بے سُدھ جسم میں نئی روح پھونک ڈالنے کی ایک ناکام کوشش تھی، قاجاری عہد کے اواخر میں یہ طرز متروک ہوگئی (۱۸) اور جدیدیت کی طرف شعراء کا میلان تیز ہوگیا۔ادیب الممالک جو دراصل مذکورہ طرز کے آخری کامیاب شعراء میں شمار ہوتے تھے، روایتی شاعری میں شہرت اور محبوبیت کے باوجود خود جدیدیت کے خواہاں تھے اور اس دور میں ان کے کلام میں جدّت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ادیب الممالک کے کلام میں جدیدیت کی طرف رجحان کے مظاہر میں سے، فراماسونری کی تحریک میں ان کی شمولیت، فرانسیسی زبان کی تعلیم، ٹھیٹھ فارسی زبان میں شعر گوئی، عوامی تہذیب وثقافت وطرز بیان کی طرف خاص توجہ، اور سب سے بڑھ کر سیاسی سرگرمیوں میں براہ راست شرکت، اور اخبار نویسی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔(۱۹) مذکورہ وجوہات کی بنا پر وہ اپنے بعض ہمعصر قدامت پسند اور روایتی شعراء سے الگ راستہ انتخاب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔بعض مقامات پر بہت دبے اور مبہم انداز میں، موہوم محبوب کے بارے میں اوہام تراشی اور نالائق ممدوحین کی مدح سے خلاصی کی کوشش کرتے ہیں اور فارسی کی کئی صدیوں پر مبنی روایتی شاعری کے جکڑ سے رہائی حاصل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔(۲۰) اس موقع پر ان کے کلام وخیالات میں، مولانا حالی کے انداز فکر کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ان کا یہ جذبہ جو تکرار سے بیزاری کا برملا اعلان ہے، قابل قدر ہے۔ایک جگہ شعراء کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

اے ادبا تا بہ کی معانی بے اصل　　می بطراز یدا بجد وکلمن را (۲۱)

یوں اس طرح وہ بھی خیالی محبوب اور شعراء کے ذریعہ اُس کی ہوس آمیز سراپا نگاری کی مذمت کرتے ہوئے، ان پر ابجد وکلمن تراشنے کا الزام لگاتے ہیں۔دوسری جگہ پر لکھتے ہیں:

تا کی اے شاعر سخن پرداز　　می کنی وصف دلبران طراز
دفتری پر کنی ز موہومات　　کہ منم شاعر سخن پرداز
ذم ممدوح گر کنی ز غرض　　مدح مذموم گر کنی ز آز
غصہ ی قیس وقصہ ی لیلی　　حرف محمود وسرگذشت ایاز
کہنہ شد این فسانہ ہا یک سو　　کن حدیث نوی ز سر آغاز (۲۲)

اس طرح وہ شعراء کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ کب تک دلبروں کے وصف میں موہومات سے اپنا دفتر مملو کرتے رہو گے؟ اور کب تک شائستہ لوگوں کی، خصومت کی رو سے ذم لکھو گے یا کب تک نالائق لوگوں کی، طمع کی رو سے مدح کرو گے؟ اب یہ قصے پرانے ہوگئے ہیں۔اس لیے نئے سرے سے نئی بات کی بنیاد رکھو! یوں وہ کلاسیکی روایت کے پرستار شعراء پر تنقید کرتے ہوئے، ان کو مذکورہ بالا باتوں سے دوری کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور معاشرتی مسائل ومشکلات کی طرف توجہ کرنے کی رغبت دلاتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، ایرانی معاشرے میں سیاسی تبدیلیوں کے باعث، مشروطیت کی طرز حکومت مختصر عرصے کے لیے قائم ہوئی اور اس بنا پر شاعر اور ادیب بھی اس معاشرے کے رکن کے طور پر اس تبدیلی میں شریک ہوگئے اور اپنی تخلیقات میں اس کا اظہار کرنے لگے۔ایسے حالات میں، فارسی کی روایتی شاعری نے اپنی تمام خوبصورتیوں، سورماؤں، دلربا اور ناقابل وصل معشوقاؤں اور دسترس سے دور دنیاؤں اور اس دنیا کے تخیل آمیز، درباری اور اشرافی خیالات کو چھوڑ کر ایک نئی دنیا میں قدم رکھنے کی کوشش کی۔

(۲۳) یہ نئی دنیا عوام کی دنیا تھی جو درباری زرق و برق اور جلوہ افروزیوں سے بڑی حد تک دور تھی۔ اس دور میں اکثر شعراء ان عوام کے ہم آواز ہو گئے۔ ادیب الممالک بھی ایسے شعراء میں شامل تھا۔ بلکہ اب بھی صف اول کے شعراء کے ساتھ مل گئے۔ جیسا کہ کہا گیا شروع میں وہ بھی اس خیال میں مبتلا تھے کہ مشروطیت کے طرز حکومت میں عوام کو حقیقی آزادی ملے گی اور پسماندگی کا یہ عفریت، ایران اور ایرانیوں کو رہا کرے گا۔ لیکن استعماری طاقتوں کی سازش سے، نہ صرف انقلاب کو کامیابی نہ ملی، بلکہ ملک اور عوام، پہلوی خاندان کی شکل میں، ایک نئی آمریت کی زنجیر میں اسیر ہو گئے۔ ان حالات میں مشروطیت سے دل برداشتہ ہو کر، ادیب الممالک نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور طنز و ہجو ہزل کی شکل میں اپنی نارضایتی کا اعلان کیا۔ ایک ترجیع بند کا پہلا شعر درج ذیل ہے:

دیدہ در خون جگر زد غوطہ　　بادلعنت بہ چنین مشروطہ (۲۴)

ادیب الممالک ایک شاعر اور فنکار کے طور پر، ہمیشہ اپنے دور کے ترجمانی کرتے رہے۔ کلاسیکی روایت کی پاسداری اور اس کے پسندیدہ مضامین کا بیان ہو یا کہ دنیا میں نئی تبدیلیوں کے باعث، استعماری قوتوں کے ملک میں ظلم و ستم کا بیان ہو یا اپنے دور کے ظالم بادشاہوں اور امراء و اشراف کے ہاتھوں ملک و عوام کی بربادی کا ذکر، ہر حال میں وہ اپنے دور کے ترجمان معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے میں جب ملک کو ہاتھ سے نکلتے ہوئے دیکھتے ہیں تو قصائد اور قطعوں کے ضمن میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ اگر ادیب الممالک کے دیوان پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ انھوں نے مستزاد اور دوبیتی کے سوا، تمام ہیئتوں میں طبع آزمائی کی۔ البتہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ غزل کے میدان میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے باوجود کہ ۱۵۰ کے لگ بھگ قصائد، ۳۶۶ قطعے، ۵۸ مثنویاں ان کے دیوان میں موجود ہیں، لیکن ان کی غزلیات کے اشعار ۳۰۰ سے کم ہیں۔ (۲۵) مرحوم موسوی گرمارودی کا خیال ہے کہ وہ قصیدہ، قطعہ، مسمّط اور مثنوی کے میدان میں زیادہ کامیاب ہیں۔ ان میں ان کے قصیدے اور قطعے بہت بہتر ہیں اور ان دونوں میں سے ان کے قطعے سب سے بہتر ہیں۔ (۲۶) اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ جس بات نے ادیب الممالک کو ان کے دیگر ہمعصروں سے ممتاز شاعر کے طور پر دکھایا ہے، ان کے کلام میں شاعر کے اپنے دور کی صحیح آواز کی گونج ہے۔ خاص طور پر مشروطیت اور اس کے بعد کے دور میں جب وہ ایران اور اسلامی دنیا کی ناگفتہ بہ حالات کی ترجمانی کرنے لگتے ہیں۔ ادیب الممالک کی شاعری کے بارے میں بہت سے محققوں اور دانشوروں نے اپنی آراء دی ہیں، جن سے جہاں ایک طرف ادیب الممالک کی فارسی ادب میں اہمیت واضح ہو جاتی ہے، دوسری طرف ان کی شاعری پر مزید تحقیقات کی ضرورت بھی معلوم ہوتی ہے اور ان تمام آراء کے ذکر کے لیے اس مختصر مضمون میں گنجائش ہے اور نہ یہ باتیں براہ راست مضمون کے عنوان سے مربوط ہیں۔ اس ضمن میں آخری بات یہ ہے کہ ادیب الممالک زبان کے میدان میں اور ایران اور اسلامی تاریخ و ادب، قصہ کہانیوں اور حکمت و نجوم اور دیگر علوم پر ناقابل تردید مہارت رکھتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے کلام میں ادبی تلمیحات و استعارات و اشارت کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ یہ اگرچہ ایک پہلو سے قابل قدر ہے لیکن ڈاکٹر غلام حسین یوسفی کے بقول ان اوصاف نے قاری کے لیے ان کے قصائد کے فہم کو دوراز ذہن اور مشکل بنایا ہے۔ (۲۷)

اس سے قبل، انیسویں صدی کے نصف دوم اور بیسویں صدی کے ربع اول میں ایران میں ادبی، معاشرتی اور سیاسی حالات کا جائزہ پیش ہوا۔ اب مذکورہ دور کا ایک مختصر مطالعہ ہندوستان اور اس خطے میں رونما ہونے والے واقعات کی روشنی میں پیش خدمت ہے۔

> ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد اسلامی معاشرہ بڑی تیزی سے زوال پذیر ہو رہا تھا۔ اغیار اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ مسلمانوں کو کچل کر رکھ دیں گے کہ ان کے خیال میں انھی نے آزادی کے شعلوں کو ہوا دی تھی۔

جاگیرداریاں بڑی تیزی سے مٹ رہی تھیں، اشراف کا طبقہ گم ہوتا چلا جارہا تھا۔ اگر اس موقع پر سرسید اور ان کے رفقا معاشرے کے بدلتے ہوئے تغیرات کا رخ موڑ نہ دیتے، تو آج ہندوستان کی تاریخ بدلی ہوئی ہوتی۔ سرسید نے اپنے گردوپیش کے حالات کا جائزہ لیا تو انھیں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی سیاسی اور اقتصادی تباہی کے عوامل یوں تو بہت ہیں، لیکن مؤثر ترین عناصر دو ہیں، ایک تو یہ ہے کہ وہ جدید تعلیم سے وحشت زدہ تھے اور دوسرے یہ کہ ادبی تخلیقات کو فرار کا ایک ذریعہ سمجھ کر ان تحریروں کے دلدادہ ہوتے جارہے تھے جو کچھ عرصے کے لیے انہیں غم روزگار سے نجات بخش دیں۔ (۲۸)

جیسا کہ اس اقتباس سے بھی ظاہر ہورہا ہے، ایران اور ہندوستان کے عوام اور خاص طور پر ہندوستانی مسلم، ایرانیوں کی طرح ایک ہی آہنی کمند میں گرفتار ہورہے تھے بلکہ جکڑے ہوئے تھے، لیکن اس کے باوجود یوں ہوتا ہے کہ ہمیشہ معاشروں میں کچھ آگاہ دل رکھنے والے راہبر موجود ہوتے ہیں کہ زوال آمادہ قوم کو حتمی زوال سے نجات دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے ایران اور ہندوستان کی تاریخ پر ایک نظر دوڑائی جائے تو ایسے راہبر واضح طور پر نظر آئیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کے ہندوستان میں، انگریزی استعمار کے خلاف مسلمانوں نے علم بغاوت بلند کرکے، ایک بنیادی انقلاب کے خواہشمند تھے، لیکن بدقسمتی سے ان کو بڑی شدت سے شکست ہوئی۔ مسلمان انگریزی ظلم وستم کا نشانہ بن رہے تھے، حالانکہ اس سے کچھ عرصہ پہلے وہ، ہندوستان کا چشم چراغ تھے اور تخت اقتدار سے یہ زبردستی جدائی ایک ایسا صدمہ تھا جس کی برداشت، ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ ان حالات میں سرسید احمد خان جیسے قائد کی رہنمائی میں، بہت جلد مسلمانوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اس ٹھونسے ہوئے حالات کا مقابلہ کرنے لگے۔ انھی کی پرزور سفارش سے مولانا حالی نے ۱۸۷۹ء میں اپنی مشہور نظم ''مسدّس مدوجزر اسلام'' کو شائع کیا۔ یہاں بہتر یہ ہے کہ برسبیل تذکرہ، حالی کی سیاسی اور ادبی خدمات اور کارنامے پر ایک مختصر نظر ڈالی جائے۔ پانی پت کی فضا، نوجوان الطاف حسین کے لیے تنگ نظر آئی تو وسیع تر دنیا کی تلاش میں، بتائے بغیر، دلّی آگئے۔ یہاں وہ کم وبیش ڈیڑھ برس رہے اور مختلف اساتذہ سے کسب علم کیا۔ اس دوران کبھی کبھی مرزا اسداللہ خان غالب کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ غالب سے ان کے قصائد اور اشعار کے فہم میں جہاں دقت پیش آتی تو ان کی وضاحت، خود غالب سے پوچھتے۔ بلکہ غالب ہی نے حالی کو شاعری کرنے کی ترغیب دلائی۔ (۲۹) اگرچہ چند سال دوبارہ وطن واپس جانا پڑا، لیکن پھر بھی دلّی کے ماحول نے ان کو اپنی طرف جذب کرلیا۔ اس دفعہ دہلی میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی مصاحبت میسر آئی۔ اس صحبت کا اثر حالی کی شاعری پر بھی واضح ہے۔ شاعری میں مبالغہ کو ناپسند شمار کرنا، حقائق وواقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کا بیان، غالب وشیفتہ کی شاگردی وہمنشینی کے ثمرے ہیں۔ شیفتہ کی وفات کے بعد، ان کی زندگی کا ایک اہم دور شروع ہوتا ہے۔

۱۸۷۲ء میں انھیں لاہور میں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت مل گئی، جہاں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی درستی اور ان کی نظر ثانی کا کام ان کے ذمے تھا۔ چار برس تک وہ یہ کام کرتے رہے اور بہت سی انگریزی کتابیں ترجمے کی صورت میں ان کی نظر سے گزریں۔ ان کتابوں کے مطالعے سے وہ مغربی خیالات سے متعارف ہوئے۔ (۳۰)

یہ ایک اہم واقعہ تھا جس سے ان کے خیالات میں وسعت آگئی اور مشرقی ادب یعنی اردو اور فارسی ادب کے بارے میں وہ جدید آراء اپنانے لگے۔ لاہور میں مولانا محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائیڈ کے اشارے پر موضوعاتی مشاعروں کی بنیاد ڈالی، تو حالی نے ''حب وطن'' اور ''مناظرہ رحم وانصاف'' جیسی اپنی چند مشہور نظموں کو ان جلسوں میں پیش کیا۔ ان سے جہاں حالی کی

جدیدیت اور جدید خیالات کے ساتھ ہم آہنگی کے ثبوت بہم پہنچے، خود سرسید کو بھی ایسی شخصیت ملی جو آگے جا کر ''مسدّس مدّ وجزر اسلام'' کی شکل میں، ایک ناقابل فراموش کارنامہ سرانجام دینے والی تھی۔ پانی پت سے شروع ہونے والے اس طویل سفر کا انجام، قومی وملی خدمات پر منتج ہوا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے:

> اگر حالی کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو وہ پرانے خیالات کے آدمی نظر آتے ہیں اور شاعر ہونے کے ناتے زیادہ تر عینیت پسند اور کم واقعاتی دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کی عام باتوں کو بدلنے کی طرف کم توجہ دی اور قوم کے مزاج، اس کی روح، اس کے فکر ونظر کو بدلنے کے لیے ادب وشعر کو وسیلہ بنایا۔ حالی کی نظر میں یہ کام انگریزوں کی نقل سے زیادہ اپنی پرانی روایات میں واپس جانے سے ہوسکتا تھا۔ (۳۱)

ڈاکٹر صاحب کے خیالات سے متفق ہونا ہی، حالی کے خیالات اور نظریات کے صحیح ادراک میں مدد ہے۔

اگر ان دونوں ادیبوں کی ذاتی اور انفرادی خصوصیات کو دیکھیں، یقیناً ان کی شخصیات اور افکار کو پیش نظر رکھتے ہوئے، ان میں بہت سے اختلافات بھی نظر آئیں گے۔ ادیب الممالک نے اپنی شاعری کا آغاز امراء واشراف اور بادشاہوں کی قصیدہ گوئی سے کیا۔ کبھی شہزادہ طہماسب میرزا مؤیدالدولہ کی، کبھی حسن علی خان امیر نظام گروسی کی اور کبھی مظفرالدین شاہ قاجار کی مدح میں قصائد لکھے۔ لیکن حالی کے دور کے ہندوستان میں نہ قابل مدح امراء واشراف رہتے اور نہ کوئی مقتدر بادشاہ! اس پر مزید یہ کہ ان کی ذات میں قصیدہ گوئی کی طرف رجحان بھی نہیں تھا۔ انھوں نے غزل گوئی سے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور اس صنف میں غالب جیسے استاد فن سے قبولیت کی سند حاصل کرلی۔ (ترجمہ حالی بہ نقل از جمیل جالبی، ۹۲۹) حالی نے دیگر اصناف نظم مثلاً مثنوی، ترکیب بند وترجیع بند اور قطعے لکھنے میں ناقابل فراموش کارنامے سرانجام دیے۔ اس پر مزید، انجمن پنجاب کے زیر اثر، موضوعاتی شاعری اور نیچرل شاعری کے علمبردار بن گئے۔ اس پہلو سے اگر ادیب الممالک کی شاعری کے مختلف ادوار اور ان کے پسندیدہ اصناف کو دیکھا جائے، جیسا کہ اس سے پہلے مذکور ہوا، وہ غزل جیسی ہر دلعزیز صنف میں کوئی خاص کارنامہ سرانجام نہیں دے سکے، بلکہ قصیدہ اور قطعہ اور مثنوی نگاری میں زیادہ کامیاب رہے اور ان اصناف کیساتھ ساتھ مسمّط، ترکیب بند اور ترجیع بند جیسی ہیئتوں میں وقتاً فوقتاً طبع آزمائی کی۔ (۳۲)

ان دونوں شعراء میں ایک اور مشترک بات قومی وملی شاعری سے دلچسپی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تو حالی کے کلام کو دو عناوین کے ذیل میں تقسیم کی ہے: حالی کی قومی شاعری (منظومات) اور حالی کی غزل۔ (۳۳) ان کا خیال ہے کہ

> ان کے سامنے ایک بڑا اور واضح مقصد تھا اور وہ تھا اس قوم کی ذہنی اور روحانی چارہ سازی، جو سیاسی بساط کے الٹ جانے کی وجہ سے انتشار، بے حسی اور ناامیدی کے منجدھار میں گھری ہوئی تھی۔ حالی نے متعدد نظمیں اور قطعات لکھے ہیں جو اخلاقی، تعلیمی، اصلاحی اور قومی وملی کے ذیل میں آتے ہیں۔ (۳۴)

ادیب الممالک کے کلام میں بھی بیشتر نقادوں اور محققوں نے اس خصوصیت کی نشاندہی کی ہے۔ غلام حسین یوسفی، ادیب الممالک کے کلام میں مدائح کی طرف اشارہ کے بعد لکھتے ہیں کہ کچھ عرصے کے بعد، ایرانی معاشرے میں جدید افکار کی اشاعت کے بعد، ان کے طبع شعر سے بہت سی وطنی اور تنقیدی نظمیں ٹپکتی ہیں، جن میں وہ لوگوں کو بیداری اور سعی پیہم کی دعوت دیتے ہیں۔۔۔ اب ان کی شاعرانہ طبع اور استادانہ ذوق مکمل طور پر وطن دوستی اور نئے تفکرات اور لوگوں کی مشکلات کے بیان اور معاشرے کی خرابیوں اور ان کے رفع ودفع کرنے کے لئے چارہ سازی پر صرف ہوتا ہے۔ (۳۵)

مختصر الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ پانی پت کے نوجوان شاعر، گزرتے ایام کے ساتھ، الطاف حسین سے مولانا الطاف

حسین اور شمس العلماء میں بدل گئے اور ادیب الممالک، میرزا صادق سے امیری، امیر الشعراء اور ادیب الممالک بن گئے۔ شاعری کے علاوہ ان دونوں میں اہم مشترک امور میں سے، دینی امور سے دلچسپی اور اخلاقی امور پر خاص توجہ اور اس کے ساتھ ساتھ وطن دوستی اور معاشرے میں اصلاح کی خواہش بھی شامل ہیں۔ ان مشترکہ امور کے علاوہ، حالی کے مسدّس اور ادیب الممالک کے مسمّط کے چند بند میں مشترکہ موضوعات اور مضامین بھی موجود ہیں۔

یہاں ایک خاص بات کا ذکر بہت ضروری نظر آتا ہے۔ وہ بھی مسمّط اور مسدّس کے ادبی اصطلاحات کے طور پر فارسی اور اردو ادب میں مفاہیم اور تعریفوں کا ذکر ہے۔ فارسی ادب میں ''مسدّس'' کسی ایک مستقل صنف نظم کا نام نہیں، بلکہ دراصل ''مسمّط'' کی ایک شکل ہے۔ لیکن اردو میں مسدّس اور مسمّط میں فرق رکھا جاتا ہے۔ اگرچہ اس مضمون میں مستقل طور پر فارسی اور اردو ادب میں ان دونوں اصطلاحات کے بارے میں بحث کی گنجائش نہیں، لیکن اس حدّ تک تو کہنا ضروری ہے کہ اردو ادب میں یہ دونوں الگ الگ ہیئتیں شمار ہوتی ہیں، جبکہ فارسی میں، مسدّس، مسمّط کا ایک ذیلی عنوان شمار کیا جاتا ہے۔

> مسمّط مصدر تسمیط کا اسم مفعول ہے، جس کا معنی موتی پرونے کا ہے۔ ادبی اصطلاح میں یہ فارسی کی ادبی روایت میں چند بندوں پر مشتمل ایسی نظم ہے جس کے ہر بند میں تین سے لے کر، سات ہم وزن و ہم قافیہ مصرعے ہوتے ہیں۔ ان بندوں کو جداگانہ قافیے کا ایک مصرع، ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔۔۔ ایسی نظم کے بندوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں، لیکن ہر بند میں مصرعوں کی تعداد کے برابر ہونے کی عام طور پر پابندی کی جاتی ہے۔(۳۶)

اب مسدّس اور مسمّط کی تعریف کا ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' سے بعینہ ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں مسمّط کے بارے میں یوں لکھا گیا ہے:

> ۔۔۔ شاعری کی اصطلاح میں مسمّط کے معنی ہیں وہ نظم جو تین تین، چار چار، پانچ پانچ، چھے چھے [کذا]، سات سات، آٹھ آٹھ، نو نو، دس دس مصرعوں پر مشتمل دو یا دو سے زیادہ بندوں کی شکل میں لکھی جائے۔ مسمّط میں پہلے بند کے تمام مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں، بعد میں آنے والے ہر بند کے مصرعے (سوائے مصرع آخر کے) پہلے بند سے قافیے رکھتے ہیں، مگر آپس میں متحد القوافی ہوتے ہیں۔۔۔ ہر بند میں مصرعوں کی تعداد برابر ہوتی ہے۔(۳۷)

جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے، فارسی اور اردو ادب میں مسمّط کے اصل مفہوم میں کوئی فرق نہیں۔ سوائے اس کے کہ فارسی تعریف میں ہر بند کے زیادہ سے زیادہ سات سات مصرعے ہوتے ہیں، جبکہ اردو تعریف کی رو سے اس میں دس دس مصرعے بھی ہو سکتے ہیں۔ کشاف میں مسدّس کو مسمّط کی ایک قسم شمار کیا گیا ہے اور اس کی تعریف یوں لکھی گئی ہے:

> مسدّس اس نظم کو کہتے جو چھ چھ مصرعوں کے بندوں کی شکل میں لکھی جائے۔ پہلے بند کے تمام مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں، بعد میں آنے والے ہر بند کے پہلے پانچ مصرعے الگ قافیہ رکھتے ہیں۔ یعنی آپس میں متحد القوافی ہوتے ہیں اور چھٹا مصرع پہلے بند کے ساتھ ہم قافیہ ہوتا ہے۔(۳۸)

اس تعریف میں اور مسمّط کی تعریف میں بھی کوئی خاص فرق نہیں۔ مسدّس کو مسمّط کی ایک قسم ہونے کے ذکر کے بعد، ابوالاعجاز حفیظ صدیقی آگے جا کر لکھتے ہیں:

> لیکن اردو شاعروں نے مسدّس کے نظام قوافی میں ایک ایسا تغیر کیا ہے جو اردو شاعری کو بہت راس آیا ہے، چنانچہ مسدّس کی مذکورہ شکل تو خال خال نظر آتی ہے۔۔۔ اس بدلی ہوئی ہیئت میں چار مصرعے متحد القافیہ کہے

جاتے ہیں اور پھر دو مصرعے الگ قافیے میں بصورت بیت مصرع کہ کر ان کے ساتھ اضافہ کر دیے جاتے ہیں
اور اس طرح چھ مصرعوں کا ایک بند مکمل ہو جاتا ہے۔(۳۹)

اس اخیر تعریف کی رو سے فارسی ادب میں ایک ایسا کوئی مستقل ادبی صنف یا ہیئت موجود نہیں۔ البتہ اس تعریف میں ایک ترکیب ''بیت مصرع'' قابل غور ہے۔ اگر اس ترکیب کے بجائے یہ کہا جائے کہ بند کے مصرعے کی جگہ مسدّس میں ایک ہم قافیہ شعر لکھا جاتا ہے تو بات صحیح نظر آتی ہے۔ ایک بات کا ذکر ضروری ہے کہ فارسی کے بعض شعراء، مسمّط میں دوسرے شعراء کی غزلیات کے اشعار کو بطور تضمین استعمال کرتے جو اردو ادب میں رائج مسدس کے قریب ہے۔ بہر حال اس بات کی وضاحت کی ضرورت تھی کہ فارسی میں مسدّس ایک مستقل صنف یا ہیئت نہیں اور دراصل وہ بھی ہر شکل میں مسمّط کے ذیل میں آتا ہے۔

ادیب الممالک نے ایک مسمّط (۱۳۲۰ق) آنحضورؐ کی میلاد مبارک پر لکھا اور مشہد سے شائع ہونے والے اخبار ''ادب'' میں پہلی بار شائع کیا۔ (آرین پور، ج۲، ۱۴۰) یہ نظم، ۷ مصرعوں کے ۳۷ بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلے بند کا ساتواں مصرع، دیگر بند کے ساتویں مصرعوں کے ساتھ ہم قافیہ ہے۔ لیکن ہر بند کے دیگر چھ مصرعے آپس میں ہم قافیہ ہیں۔ اس مسمّط میں شاعر شروع میں تمہید کے طور پر، اونٹ اور محمل کا ذکر کے قاری کے ذہن کو عرب کی سرزمین اور اس سرزمین کی خصوصیات کی طرف لے جاتے ہیں، جہاں سرور کائناتؐ کی ولادت بابرکت ہوئی:

برخیز شتر بانا! بر بند کجاوہ — کز چرخ ہمی گشت عیان رایت کاوہ
وز شاخ شجر برخاست آوای چکاوہ — وز طول سفر، حسرت من گشت علاوہ
بگذر بہ شتاب اندر، از رود سماوہ — در دیدہ ی من بنگر دریاچہ ساوہ
وز سینہ ام آتشکدہ ی فارس نمودار (۴۰)

نظم کے شروع ہی میں نبی اکرمؐ کی پیدائش اور اس مبارک زمانے کی دو بڑی اعجاز آمیز نشانیوں یعنی، ایران میں ساوہ کے عظیم جھیل کے خشک ہونے اور زرتشتیوں کے عظیم آتشکدہ کی آگ کے سرد ہونے کی بات ہوئی ہے۔ اس واقعے کی خوشخبری سنانے کے لیے اور اس خبر کے سننے سے خوشی کی فضا کی تخلیق کے لیے شاعر نے چند بند لکھے ہیں۔ مولانا حالی نے بھی مسدس میں کئی بندوں میں آنحضرتؐ کی ولادت بابرکت کی طرف اشارے کیے ہیں:

ہوا غلغلہ نیکیوں کا بدوں میں — پڑی کھلبلی کفر کی سرحدوں میں
ہوئی آتش افسردہ آتشکدوں میں — لگی خاک سی اڑنے سب معبدوں میں (۴۱)

ادیب الممالک، نویں بند میں ''شق'' و ''سطیح'' عربستان میں عہد جاہلیت کے دو کاہن (یہودی مذہبی رہنما) کی پیشین گوئی اور ایرانی بادشاہ کی محل کے چار عظیم ستونوں کے گرنے کی تعبیر کی طرف اشارہ کر کے قاری کو عیسائی پادری کے ذریعے ان باتوں کی رمز کشائی کا حکم دے کر، کہتے ہیں کہ یہ ''آیت میلاد نبیؐ سید مختار'' کی نشاندہی کرے گا۔ (۴۲) اس کے بعد اگلے بندوں میں، آنحضرتؐ کی نعت کا آغاز ہوتا ہے:

فخر دو جہان، خواجہ ی فرّ خ رخ اسعد — مولای زمان، مہتر صاحب دل امجد
آن سیّد مسعود و خداوند مؤیّد — پیغمبر محمود، ابوالقاسم احمدؐ
وصفش نتوان گفت بہ ہفتاد مجلّد — این بس کہ خدا گوید ''ما کان محمّد''
بر منزلت و قدرش یزدان کند اقرار (۴۳)

شاعر چھٹے بند سے ۱۷ ویں بند تک براہ راست نعت کے اشعار لکھتے ہیں اور اس کے بعد ایران اور دنیائے اسلام کی مشکلات کی

بات کا آغاز کر کے یوں کہتے ہیں کہ:

اندُہ زسفر آمد و شادی سفری شد　　　دیوانہ بہ دیوان تو گستاخ و جری شد (۴۴)

حالی بھی مسلمانوں پر بُرے وقت کے آنے کی خبر دی ہے:

برے ان پہ وقت آ کے پڑنے لگے اب　　　وہ دنیا میں بس کر اجڑنے لگے اب
بھرے ان کے میلے بچھڑنے لگے اب　　　بنے تھے وہ جیسے بگڑنے لگے اب
ہری کھیتیاں جل گئیں لہلہا کر　　　گھٹا کھل گئی سارے عالم پہ چھا کر (۴۵)

۱۹ویں بند میں مسلمانوں کی عظمت و جہانداری اور مختلف مما لک میں ان کی حکومتوں اور شان و شوکت کا ذکر کرتے ہیں۔ مذکورہ مماثلتوں اور اشتراکات کے علاوہ، اس بند سے لے کر اگلے دس بندوں میں اس ایرانی شاعر کا لہجہ، الطاف حسین حالی کے مسدّس والے لہجے سے بہت قریب ہو جاتا ہے اور بیشتر مضامین بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ۳۱ویں بند سے آخر تک، ادیب الممالک اپنے عہد کے قاجاری بادشاہ، مظفرالدین شاہ کی مدح کرتے ہیں۔ ان میں شاعرانہ محاسن ہی قابل قدر ہیں ورنہ ایسے کمزور و بیمار بادشاہ کی مدح، کسی بھی وجہ سے مستحسن نہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ادیب الممالک نے یہ نظم اس وقت لکھی ہے، جب مشروطیت کا انقلاب، اس عہد کے ایرانی معاشرے میں عام نہیں ہوا تھا۔

اردو ادب کی مشہور نظم ''مسدّس مدّ و جزر اسلام'' جو'مسدّس حالی'' کے نام سے بھی پہچانی جاتی ہے، ۱۸۷۹ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ ۱۸۸۶ء میں حالی نے اس کے لیے ایک ضمیمہ لکھا۔ اس دیباچے میں خود شاعر نے نظم کا تعارف کچھ یوں بیان کیا ہے:

> اس مسدّس کے آغاز میں پان سات بند تمہید کے لکھ کر اول عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کوکب اسلام کا طلوع ہونا اور نبی اُمّیؐ کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعتاً سرسبز و شاداب ہو جانا اور اس ابر رحمت کا امّت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی و دنیوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے تنزل کا حال کہا ہے اور قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آ کر وہ اپنے خط و خال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔ (۴۶)

یہ وہ طویل نظم ہے، جس کا موضوع شروع سے آخر تک ایک ہے۔ دیباچہ کے بعد، ایک رباعی تمہید کے طور پر مذکور ہے:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے　　　اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مدّ ہے ہر جزر کے بعد　　　دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے (۴۷)

اس طویل نظم کا نقشہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اس نقشے کا خلاصہ ذیل میں اس لیے پیش خدمت ہے تا کہ ادیب الممالک کے مسمّط سے تقابل میں آسانی ہو۔ شروع میں دو بند کلیے کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد قوم کی بدحالی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دین سے گریز اور جہالت کے زمانے کے عرب کے حال کا بیان بھی ہے۔ اس کے بعد پیامبر ختمی مرتبتؐ کی تشریف فرمائی کا ذکر اور آپؐ کی نعت کا حصہ ہے۔ اس میں حالی نے آنحضرتؐ کے مثالی اور ارفع کردار کا ذکر کرتے ہیں اور معجزات کے ذکر کے بجائے آپؐ کے صدق و امانت کو رسالت کی صحیح شناخت قرار دیتے ہیں۔ ظہور اسلام کے زمانے میں اقوام عالم کا نقشہ کھینچ کر یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کی اقوام اس وقت پستی میں مبتلا تھیں اور اسلام نے ان کو اس پستی سے نجات دلائی۔ مسلم قوم کے، تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں کارناموں کا ذکر، نشر توحید و حسنات اور احیاء علوم کے منظر کئی بندوں میں مذکور ہوئے ہیں۔ اسلامی دنیا کی دو بڑی خلافتوں، خلافت بغداد اور خلافت اندلس اور ان کے انسانی تمدن کے

لیے خدمات کا بیان ہوا ہے۔لیکن جب وہ جدید دور پر نظر کرتے ہیں،تو ان کو سنہرے ادوار کے تمدن نظر نہیں آتے۔اس طرح وہ مسلمانوں کے تنزل کے دور،ان کی زبوں حالی کا ذکر بڑے دکھ کے ساتھ کرتے ہیں۔پھر وہ یورپ کی قوموں اور ہندوستان کی دوسری اقوام کی پیشرفت کے اسباب کا ذکر کر کے مسلم قوم میں خرابیوں اور برائیوں کی دلائل کا جائزہ لیتے ہیں۔

> شرک، بت پرستی،تعصب،تفریق باہمی،تفرقہ پردازی،غیبت،حسد وتکبر،کور باطنی،خُبث نفس،فتنہ انگیزی، رسوائی،خوشامد،کذب ومبالغہ،خود پسندی، بے جا فخر وغیرہ کو بیان کر کے مسلمانوں کی شاعری پر تنقید کرتے ہیں۔۔۔پھر مسلمانوں کی عام حالت کا دکھڑا سناتے ہیں اور اس طرح وہ ساری خرابیوں اور عیبوں کا ذکر کر کے قوم کو ہدایت کرتے ہیں۔۔۔اور خاتمے میں اقوام کے مٹ جانے کا حال بیان کرتے ہیں اور اس طرح یہ نظم نا اُمیدی ومحرومی پر ختم ہوتی ہے۔(۴۸)

حالی اور ادیب الممالک کے سیاسی،معاشی،معاشرتی اور ادبی ماحول کا مختصر طور پر تعارف ہوا۔ایران اور ہندوستان،انیسویں صدی کے آخر سے لمبے عرصے کے لیے انگلستان اور امریکا کے مظالم کے نشانے پر رہے۔یہ بڑا کٹھن اور مایوس کن دور تھا اور اگر سیاسی، مذہبی اور ادبی لیڈروں کی رہنمائیاں حاصل نہ ہوتیں،تو یہ دور اور زیادہ دشوار ہو کر طول پکڑتا۔محمد علی جناح،آنجہانی مہاتما گاندھی، علامہ اقبال اور آنجہانی جواہر لعل نہرو جیسے قائدین برصغیر پاک وہند میں اور شیخ فضل اللہ نوری،سید حسن مدرس اور خاص طور پر امام خمینیؒ جیسے راہبر ایران میں سیاسی اور مذہبی قیادت میں شامل نہ ہوتے،تو معلوم نہیں ان ممالک کی کیا صورتحال ہوتی۔ان زعماء کے بعد، دوسرے مرحلے پر ادیبوں اور دانشوروں کی خدمات،ملک و دین اور لوگوں کی اس استحصال واستعمار سے آزادی کی طرف گامزن ہونے کے ضمن میں قابل ذکر ہیں۔برصغیر اور ایران میں ایسے بے شمار ادیب الممالکوں اور دانشوروں کے نام لیے جاسکتے ہیں، جنہوں نے دونوں خطوں میں ہر عہد میں اپنی خدمات سرانجام دیں۔پیش خدمت مضمون کے اس حصے میں،ان کی اپنے اپنے وطن اور خاص طور پر ملت اسلامیہ کی بہ نسبت ان کے تاثرات کا سرسری ذکر کرنے کے بعد،ان کی مشہور نظموں،حالی کا مسدس اور ادیب الممالک کے مسمط کے پیش نظر،میں ملت اسلامیہ کے حالات پر ان کے مماثل جذبات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

ادیب الممالک کا مسمط اور حالی کا مسدس جیسا کہ اس سے قبل بھی کہا گیا،اشعار اور بندوں کی تعداد میں بالکل مختلف ہیں۔مسمط کے اشعار کی تعداد،بہت کم ہے اور اس کے مقابلے میں مسدس بہت ضخیم ہے۔اس ضخامت کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حالی نے ایسے بہت سے معاملات اور مسائل اپنے کلام کے موضوعات بنائے ہیں،جن کا مسمط میں ذکر تک ہی نہیں۔ اس کے باوجود جرأت کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے مقامات پر ان دونوں شعراء کے افکار وخیالات ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں۔ذیل میں ان مشترکہ افکار وخیالات کی طرف اختصار کے ساتھ اشارہ کیا جاتا ہے۔

مسدس حالی کے دو بند ملاحظہ ہوں:

گھٹا سر پہ اَدبار کی چھا رہی ہے　　فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس وپیش منڈلا رہی ہے　　چپ وراست سے یہ صدا آرہی ہے
کہ کل کون تھے،آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

پر اس قومِ غافل کی غفلت وہی ہے　　تنزل پہ اپنے قناعت وہی ہے
ملے خاک میں جو رعونت وہی ہے　　ہوئی صبح اور خوابِ راحت وہی ہے

نہ افسوس انہیں اپنی ذلت پہ ہے کچھ
نہ رشک اور قوموں کی عزت پہ ہے کچھ(۴۹)

مذکورہ بالا اشعار کے مضمون و مفاہیم کو مدنظر رکھتے ہوئے، قوم کے حال زار پر ماتم کی دوسری شکل کو ادیب الممالک کے مسمط میں سے ملاحظہ کیجیے:

افسوس کہ این مزرعہ را آب گرفتہ — دہقان مصیبت زدہ را خواب گرفتہ
خون دل مارنگ می ناب گرفتہ — وز سوزش تب پیکر مان تاب گرفتہ
رخسار ہنر گونہ ی مہتاب گرفتہ — چشمان خرد پردہ ز خونناب گرفتہ

ثروت شدہ بی مایہ وصحت شدہ بیمار

ابری شدہ بالا و گرفتہ است فضارا — از دود و شرر تیرہ نمودہ است فضارا
آتش زدہ سکان زمین را و سمارا — سوزاندہ بہ چرخ اختر و در خاک گیارا
ای واسطہ ی رحمت حق بہر خدارا — زین خاک بگردان رہ طوفان بلارا

بشکاف ز ہم سینہ این ابر شرر بار(۵۰)

مذکورہ بالا اشعار میں الفاظ کے اشتراک تو نہیں، لیکن دونوں کے ہاں امت مسلمہ کی زبوں حالی کا احساس اور اس کا ماتم مشترکہ ہے۔ اس ضمن میں، اس بدبختی و ادبار کی نشاندہی میں، ہر ایک شاعر کی طباعی اور تفکر کی جولانی قابل غور ہے۔ حالی کہتے ہیں: رنج و بدبختی کے بادل مسلمانوں کے سر پر منڈلا رہے ہیں اور ہر کہیں ان کے مناظر پیش رو ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ آواز بھی سنائی دیتی ہے کہ اے مسلم قوم سوچو! کہ ماضی میں آپ کی کیا شان و شوکت تھی اور اب کیا کچھ باقی رہی ہے؟ خواب غفلت سے اٹھنے کا وقت ہے۔ لیکن مایوسی وہاں ہوتی ہے کہ حالی کے خیال میں خواب غفلت میں سوئے ہوئے مسلم، ایک اور بدبختی کا شکار ہے کہ اپنے تنزل اور خواری پر قانع ہوئے ہیں اور ان کی رعونت خاک میں ملی ہے۔ وہ اپنی ذلت پر افسوس کرتے ہیں اور نہ ان میں رشک کا جذبہ زندہ ہے کہ دیگر اقوام کی ترقی کو دیکھ کر خود کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔

ان افسوسناک حالات سے قریب قریب کا جذبہ ادیب الممالک کے مسمط کے دو بندوں میں نظر آتا ہے۔ وہ اپنی قوم و ملت کے حال کو ایسے کھیت سے تشبیہ دیتے کہ سیلاب کی وجہ سے تمام پیداوار زائل ہوگئی ہے۔ لیکن مصیبت زدہ کاشتکار کو ہوش نہیں اور وہ بھی غفلت کی نیند میں سو رہا ہے۔ مزید کہتے ہیں کہ ہمارے دل کا خون، مے ناب کا رنگ پکڑا ہوا ہے اور بخار کی شدت سے تمام جسم جل رہا ہے۔ وہ اپنے دور میں فن اور فنکاری کے ابتر حالات کا بھی ذکر کیا ہے۔ یوں کہ اس دور کے فن کا چہرہ، چاند جیسا فق پڑ گیا ہے اور عقل و خرد کی آنکھیں لہولہان ہیں۔ اب دوسرے بند میں ان دونوں کے خیالات اور بھی قریب ہو جاتے ہیں۔ ادیب الممالک کہتے ہیں کہ ایک ایسا بادل آسمان پر چھا گیا ہے کہ جس سے تمام ماحول دھوئیں اور شرر سے تاریک ہو گیا ہے۔ آسمان و زمین کے سکّان کو وہ آگ لگی ہے، جس سے چرخ فلک پر تمام ستارے اور زمین پر تمام نباتات جھلس کر رہ گئے ہیں۔ لیکن اس بند کے آخر میں ادیب الممالک کا لحن حالی سے مختلف ہے۔ وہ پھر آنحضورؐ کی طرف متوجہ ہو کر ان کو واسطۂ رحمت حق کہہ کر کہتے ہیں کہ خدا کے لیے اس ملک سے طوفان بلا کا رخ پھیر دیجیے اور اس ابر شرر بار کے سینے کو چھیڑ دیجیے۔

۲- حالی اور ادیب الممالک گذشتہ صدیوں کے مسلمانوں کی عظمت کا اعتراف اپنے اپنے طور پر کرتے ہیں۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ ان دونوں کے لب و لہجے میں از حدّ قرابت ہے۔ پہلے حالی کے مسدّس میں سے چھ بند ملاحظہ کیجیے:

سدا ان کو مرغوب سیر و سفر تھا ہر اک براعظم میں ان کا گزر تھا
تمام ان کا چھانا ہوا بحر و بر تھا جو لنکا میں ڈیرا تو بر بر میں گھر تھا
وہ گنتے تھے یکساں وطن اور سفر کو
گھر اپنا سمجھتے تھے ہر دشت و در کو
جہاں کو ہے یاد ان کی رفتار اب تک کہ نقشِ قدم ہیں نمودار اب تک
ملایا میں ہیں ان کے آثار اب تک انہیں رو رہا ہے ملیبار اب تک
ہمالہ کو ہیں واقعات ان کے ازبر
نشاں ان کے باقی ہیں جبرالٹر پر
نہیں اس طبق پر کوئی براعظم نہ ہوں جس میں ان کی عمارات محکم
عرب، ہند، مصر، اندلس، شام، دیلم بناؤں سے ہیں ان کی معمور عالم
سرِ کوہِ آدم سے تا کوہِ بیضا
جہاں جاؤ گے کھوج پاؤ گے ان کا
ہوا اندلس ان سے گلزار یکسر جہاں ان کے آثار باقی ہیں اکثر
جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جا کر یہ ہے بیت حمرا کی گویا زباں پر
کہ تھے آلِ عدنان سے میرے بانی
عرب کی ہوں میں اس زمیں پر نشانی
ہویدا ہے غرناطہ سے شوکت ان کی عیاں ہے بلنسیہ سے قدرت ان کی
بطلیوس کو یاد ہے عظمت ان کی ٹپکتی ہے قادس میں سرحسرت ان کی
نصیب ان کا اشبیلیہ میں ہے سوتا
شب و روز ہے قرطبہ ان کو روتا
کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے
جلال ان کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا (۵۱)

مسلمانوں کے روشن ماضی جس میں وہ ہمیشہ حرکت میں تھے اور سکون و سکوت ان کو کبھی مرغوب نہیں تھا۔ وہ دنیا کے ہر ملک و شہر میں سفر کرتے تھے، برّ و بحر اور ہند و چین ان کے لیے برابر تھا۔ سفر و حضر اور دشت و در کو وہ یکسان جانتے تھے۔ حالی اگلے بندوں میں ایسے ممالک اور شہروں کا ذکر کرتے ہیں، جہاں ماضی کے مسلمانوں کے نشانات، اب بھی ان کے منتظر ہیں۔ ملایا، ملیبار، ہمالہ، جبرالٹر، عرب، ہند، مصر، اندلس، شام اور ایران میں دیلمستان اور اسی طرح کوہ آدم سے لے کر، کوہ بیضاء میں ہر کہیں ان کے قدموں کے نشان ہیں اور پوری دنیا ان کے پاؤں کے نیچے آ گئی تھی۔ اس کے بعد وہ اندلس میں مسلم تہذیب کے آثار کا ذکر کرتے ہیں، بیت حمراء کو یورپ میں عرب حکام، آل عدنان کی اولاد کی سلطنت اور حکومت کو مسلم تہذیب و تمدن کا نمونہ بتاتے ہیں۔ غرناطہ، بلنسیہ، قادسیہ، بطلیوس، اشبیلیہ اور قرطبہ وغیرہ تمام کے تمام مسلم سلطنت میں شامل تھے۔ لیکن حالی کا خیال ہے کہ اس کھوئی عظمت کو اور وہاں پر سوئے ہوئے نصیب کو جگانا ضروری ہے۔ ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھ کر، اب ادیب الممالک

کے مسمّط میں سے چند بند دیکھیے:

ما ییم کہ از پادشہان باج گرفتیم — زان پس کہ از ایشان کمر و تاج گرفتیم
دیہیم و سریراز گہر و عاج گرفتیم — اموال وذ خایرشان تاراج گرفتیم
وز پیکرشان دیبہ و دیباج گرفتیم — ما ییم کہ از دریا امواج گرفتیم
و اندیشہ نکر دیم ز طوفان وز تیار

در چین و ختن ولولہ از ہیبت ما بود — در مصر و عدن غلغلہ از شوکت ما بود
در اندلس و روم عیان قدرت ما بود — غرناطہ و اشبیلیہ در طاعت ما بود
صقلیہ نہان در کنف رأیت ما بود — فرمان ہمایون قضا آیت ما بود
جاری بہ زمین و فلک و ثابت و سیار

خاک عرب از مشرق اقصی گذرانديم — وز ناحیہ غرب بہ افریقیہ رانديم
دریای شمالی را بر شرق نشاندیم — وز بحر جنوبی بہ فلک گرد فشاندیم
ہند از کف ہندو ختن از ترک ستانديم — ما ییم کہ از خاک بر افلاک رسانديم
نام ہنر و رسم کرم را بہ سزاوار (۵۲)

پہلے بند میں ''گرفتیم'' کا فعل قابل غور ہے۔ یہ فعل ماضی پر دلالت کرتا ہے۔ ادیب الممالک بھی حالی کی طرح، ماضی کی عظمت اور اس کے تبصرے کو اہم جانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہم مسلمانوں نے دنیا کے بادشاہوں سے بادشاہت کے تاج و نشانات جو گوہر و عاج کے بنے ہوئے تھے، چھین لینے کے بعد، ہر ایک میں سے ان کے اموال و ہر چیز کو بطور باج و خراج حاصل کر لیے۔ ہم بہت دلیر تھے اور کسی چیز سے خوف نہیں کھاتے، حتیٰ کہ سمندروں کی ہیبت ناک لہروں اور طوفانوں سے ہمیں کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ دوسرے بند میں حالی کے مذکورہ بالا اشعار جیسے مفاہیم کے قریب مفاہیم، برملا نظر آتے ہیں۔ ادیب الممالک کہتے ہیں کہ چین و ختن و مصر و عدن و اندلس و روم اور غرناطہ و اشبیلیہ و صقلیہ میں ہماری شوکت، عظمت اور قدرت کارفرما تھی۔ دونوں شعراء کو اسلامی تہذیب کے پھیلاؤ اور وسعت سے بخوبی آگاہی حاصل ہے۔ لیکن ڈاکٹر غلام حسین یوسفی کے بقول، ادیب الممالک شاعری پر اپنی قدرت کی نمائش کے لیے ایسے متجانس الفاظ کا ذکر کرتے ہیں۔ (یوسفی، ۳۵۵) اس سے مفہوم کی وضاحت کے ساتھ ساتھ، کلام کی شگفتگی اور موسیقیت میں بھی مزید اضافہ ہوتا ہے۔ شاید یہ خیالات حالی کے مذکورہ بالا چند بندوں پر بھی دلالت کریں۔ بہر حال ادیب الممالک کے خیال میں مسلم قوم اور ان میں ایرانی مسلم، تقدیر الٰہی کے حکم سے تمام کائنات پر چھائے ہوئے تھی۔ تیسرے بند میں اسی بحث کو آگے بڑھا کے لکھتے ہیں، مشرق اقصیٰ سے عرب کی سرزمین اور مغرب سے افریقا اور قلزم سے لے کر بحر جنوب تک ہم نے اپنی حکومت پھیلائی تھی۔ مسلمانوں نے ہندوؤں سے ہندوستان کو اور ختن کو ترکوں سے چھین لیا۔ آخری دو شعر بہت غور طلب ہیں کہ ہم ایرانی مسلمانوں نے ہنر کے نام اور کرم کے رسم کو خاک سے افلاک تک پہنچا دیا۔

جیسا کہ ملاحظہ ہو رہا ہے ان اشعار میں حالی اور ادیب الممالک کی آوازیں مل جاتی ہیں اور دونوں برابر کے الفاظ و تأثرات سے مسلم عظمت کا نوحہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ان دونوں شعراء کے حالات کی تحقیق کے بعد کم از کم مجھے ایسا کوئی حوالہ نظر نہیں آیا، جس کی رو سے یہ کہہ سکیں کہ ادیب الممالک کی شاعری سے حالی کو آگاہی حاصل تھی یا اس کے برعکس ادیب کو حالی کے خیالات سے واقفیت حاصل تھی۔ بے شک ان دونوں مسلمان شعراء کو اپنے اپنے ملک کے حالات اور مجموعی طور پر مسلم قوم

کی مذکورہ بالا زبوں حالی ہی نے ان کو ایسے مشترکہ خیالات کا اظہار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

حواشی:

۱۔ دستگردی، وحید، ارمغان، ۶۰۳

۲۔ موسوی گرمارودی، علی، ج اول، ۳۳

۳۔ ہمان، ۲-۵۱

۴۔ کیوانی، مجدالدین، دایرہ المعارف بزرگ اسلامی، ۳۷۴

۵۔ موسوی گرمارودی، علی، ج اول، ۹۵

۶۔ ہمان، ۸-۹۷

۷۔ ہمان

۸۔ ہمان، ۱۰۰

۹۔ آرین پور، یحیی، از صبا تا نیما، ج ۲، ۱۳۷

۱۰۔ تاج بخش، اسماعیل، گزینہ اشعار ادیب الممالک فراہانی، ۸

۱۱۔ کیوانی، مجدالدین، دایرہ المعارف بزرگ اسلامی، ۳۷۴

۱۲۔ جالبی، جمیل، تاریخ ادب اردو، ج ۴، ۹۰۹-۹۰۴

۱۳۔ زرقانی، سید مہدی، چشم انداز شعر معاصر، ۶۲

۱۴۔ موسوی گرمارودی، علی، ج ۲، ۵۴۴

۱۵۔ تسلیم جہرمی، فاطمہ، طالبیان یحیی، مضامین و بن مایہ های ادبیات پایداری در اشعار ادیب الممالک فراہانی، ادبیات پایداری، ۳-۹۲

۱۶۔ آرین پور، یحیی، از صبا تا نیما، ج ۲، ۱۳۸

۱۷۔ ہمان، ۱۳۹

۱۸۔ زرقانی، سید مہدی، چشم انداز شعر معاصر، ۴۵

۱۹۔ کیوانی، مجدالدین، نوجویی در شعر ادیب الممالک فراہانی، مجلّہ دانشکدہ ادبیات، ۱۵

۲۰۔ ہمان، ۱۳

۲۱۔ آرین پور، یحیی، از صبا تا نیما، ج ۲، ۱۳۹

۲۲۔ موسوی گرمارودی، علی، ج ۲، ۶-۲۸۵

۲۳۔ زرقانی، سید مہدی، چشم انداز شعر معاصر، ۴۵

۲۴ شادروی منش، طنز در آثار ادیب الممالک فراہانی، مجلّہ دانشکدہ ادبیات و علوم انسانی، ۱۳۸

۲۵۔ موسوی گرمارودی،علی، ج اول،۱۱۵

۲۶۔ ہمان

۲۷۔ یوسفی،غلام حسین، چشمہ روشن، دیداری با شاعران،۵۰-۳۴۸

۲۸۔ سید عابد،علی عابد،اصول انتقاد ادبیات،۸۹

۲۹۔ جالبی،جمیل،تاریخ ادب اردو، ج۴،۹۰۵

۳۰۔ ہمان،۹۰۶

۳۱۔ ہمان،۹۰۱

۳۲۔ کیوانی،مجدالدین،نوجویی درشعرادیب الممالک فراہانی،مجلّہ دانشکدہ ادبیات،۱۸-۱۷

۳۳۔جالبی،جمیل،تاریخ ادب اردو، ج۴،۱۵-۹۱۴

۳۴۔ ہمان،۹۱۷

۳۵۔ یوسفی،غلام حسین، چشمہ روشن، دیداری با شاعران،۳۴۹

۳۶۔ میرصادقی،میمنت،واژہ نامہ ہنرشاعری،۲۸۲

۳۷۔ صدیقی،ابوالاعجاز حفیظ،کشاف تنقیدی اصطلاحات،۷-۱۷۶

۳۸۔ ہمان،۱۴۷

۳۹۔ ہمان

۴۰۔ موسوی گرمارودی،علی، ج۲،۷-۴۲

۴۱۔ حالی،الطاف حسین،مسدس،۲۷

۴۲۔ موسوی گرمارودی،علی، ج۲،۲-۴۳۱

۴۳۔ ہمان

۴۴۔ ہمان،۴۳۴

۴۵۔ حالی،الطاف حسین،مسدس،۳۷

۴۶۔ ہمان،۵

۴۷۔ ہمان،۹

۴۸۔ جالبی،جمیل،تاریخ ادب اردو، ج۴،۴-۹۲۳

۴۹۔ حالی،الطاف حسین،مسدس،۱۰

۵۰۔ موسوی گرمارودی،علی، ج۲،۴۳۵

۵۱۔ حالی،الطاف حسین،مسدس،۳۰-۲۹

۵۲۔ موسوی گرمارودی،علی، ج۲،۴۳۴

منابع ماخذ:

۱۔ آرین پور، یحیی، از صبا تا نیما، ج۲، تهران، انتشارات زوار، چاپ هفتم، ۱۳۷۹

۲۔ تاج بخش، اسماعیل، گزینه اشعار ادیب الممالک فراهانی، نشر قطره، تهران، ۱۳۷۴

۳۔ تسلیم جهرمی، فاطمه، طالبیان، یحیی، مضامین و بن مایه های ادبیات پایداری در اشعار ادیب الممالک فراهانی، ادبیات پایداری، دانشگاه شهید باهنر کرمان، سال دوم، شماره چهارم، بهار ۱۳۹۰

۴۔ جالبی، جمیل، تاریخ ادب اردو، ج4، مجلس ترقی ادب، لاهور، اشاعت اول، فروری ۲۰۱۲/ ربیع الاول ۱۴۳۲

۵۔ حالی، الطاف حسین، مسدس، ۱۳۰۳

۶۔ دستگردی، وحید، ترجمه ادیب الممالک، ارمغان، شماره نهم، سال چهاردهم، آذر ماه ۱۳۱۲

۷۔ سید عابد، علی عابد، اصول انتقاد ادبیات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاهور، ۱۹۷۷

۸۔ زرقانی، سید مهدی، چشم انداز شعر معاصر ایران، نشر ثالث، تهران، چاپ سوم ۱۳۸۷

۹۔ شادروی منش، محمد، طنز در آثار ادیب الممالک فراهانی، زبان و ادبیات فارسی، مجلّه دانشکده ادبیات و علوم انسانی، دانشگاه تربیت معلم، شماره ۴۳ و ۴۲، پاییز و زمستان ۱۳۸۲

۱۰۔ صدیقی، ابوالاعجاز حفیظ، مرتبہ؛ آفتاب احمد خان، نظر ثانی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم، ستمبر ۱۹۸۵

۱۱۔ عابدی، کامیار، مویه هایی به یاد کشور جم در شناخت شعر ادیب الممالک فراهانی در نود مین سال در گذشت وی، بخارا، شماره ۶۶، مرداد و شهریور ۱۳۸۷

۱۲۔ کیوانی، مجدالدین، نوجویی در شعر ادیب الممالک فراهانی، مجلّه دانشکده ادبیات و علوم انسانی، بهار و تابستان ۱۳۷۳، ش۴ و ۵

۱۳۔ کیوانی، مجدالدین، ادیب الممالک، دایره المعارف بزرگ اسلامی، ج۷، زیر نظر کاظم موسوی بجنوردی، تهران، انتشارات دایره المعارف بزرگ اسلامی، چاپ دوم، ۱۳۷۷

۱۴۔ موسوی گرمارودی، علی، زندگی و شعر ادیب الممالک فراهانی، جلد اول و دوم، انتشارات قدیانی، چاپ دوم ۱۳۸۶

۱۵۔ میر صادقی، میمنت، واژه نامه هنر شاعری، فرهنگ تفصیلی اصطلاحات فن شعر و سبک ها و مکتب های آن، کتاب مهناز، چاپ چهارم/ ویراست سوم، زمستان ۱۳۸۸

۱۶۔ یوسفی، غلام حسین، چشمه روشن، دیداری با شاعران، انتشارات علمی، چاپ اول، پاییز ۱۳۶۹